درس ۲۳

مدنی دور کے آغاز میں
اہل ایمان کو پیشگی تنبیہ
سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۵۳ تا ۱۵۷ کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم ...... امّا بعد:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۞ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۞ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۞ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ لا قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۞ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ قف وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ۞﴾ ...... صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے پانچویں حصّے کا تیسرا درس سورۃ البقرۃ کی پانچ آیات (۱۵۳ تا ۱۵۷) پر مشتمل ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ یوں ہے:

''اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور مت کہو اُن کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں' مردہ! بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔ اور ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کچھ خوف سے' بھوک سے اور مال و جان کے نقصان سے اور نتائج و ثمرات کے ضیاع سے۔ اور اے نبی! خوشخبری سنا دیجیے ان صبر کرنے والوں کو کہ جن پر اگر کوئی مصیبت ٹوٹتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جن پر اُن کے ربّ کی جانب سے عنایتیں ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ کہ جو راہ یاب ہونے والے ہیں۔ (منزلِ مراد تک پہنچنے والے ہیں۔)

ان آیات سے درحقیقت سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کا آغاز ہو رہا ہے' تاہم اس بات کو سمجھنے کے لئے سورۃ البقرۃ کے زمانۂ نزول کو ذہن میں رکھنا اور اس کے مضامین کے درمیان جو ایک نہایت گہری حکیمانہ ترتیب ہے' اس پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ زمانۂ نزول کے اعتبار سے سورۃ البقرۃ پہلی مدنی سورت ہے۔ تقریباً ڈھائی پاروں پر پھیلی ہوئی اور ۲۸۶ آیات پر مشتمل قرآنِ حکیم کی یہ طویل ترین سورۃ اکثر و بیشتر ان آیات پر مشتمل ہے جو ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک وقتاً فوقتاً نازل ہوئیں۔ صرف چند آیات مستثنیٰ ہیں' مثلاً سود کی حرمت سے متعلق آیات اور قرض کے لین دین سے متعلق احکام پر مشتمل طویل آیت جو کہ مدنی دَور کے آخری زمانے سے متعلق ہیں' یا پھر سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیتیں جن کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ معراج کی شب نبی اکرم ﷺ کو اُمت کے لئے تحفے کے طور پر عطا ہوئیں۔ باقی قریباً پوری سورۃ ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل کے عرصے کے دوران نازل ہوئی جس کا دورانیہ کم و بیش دو سال بنتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے اور ان دونوں سورتوں کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت ہے' گو مصحف میں ان کے مابین لگ بھگ پندرہ پاروں کا فصل ہے' سورۃ البقرۃ بالکل آغاز میں ہے اور تیسرے پارے کے قریباً نصف تک چلی گئی ہے' جبکہ سورۃ الحج سترہویں پارے کے نصف آخر میں ہے' تاہم زمانۂ نزول کے اعتبار سے یہ دونوں سورتیں متصل ہیں۔

سورۃ البقرۃ۔ دو اُمتوں کی سورت

سورۃ البقرۃ کے دو بڑے بڑے حصے ہیں۔ پہلے حصے میں رکوعوں کی تعداد دوسرے حصے کے مقابلے میں قدرے کم ہے لیکن آیات کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ حصہ اٹھارہ رکوعوں اور ایک سو باون آیات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصے میں رکوع بائیس ہیں اور آیات ایک سو چونتیس ہیں۔ گویا ایک خوبصورت توازن یہاں موجود ہے۔ تقریباً نصفین پر یہ سورۂ مبارکہ تقسیم کی جا سکتی ہے۔ نصفِ اوّل میں خطاب کا رخ

تقریباً کُل کا کُل بنی اسرائیل کی طرف ہے' جبکہ نصفِ ثانی میں خطاب اُمتِ مسلمہ سے بحیثیتِ اُمّتِ مسلمہ ہے۔ ویسے بنی اسرائیل سے براہِ راست خطاب کا آغاز پانچویں رکوع سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پندرہویں رکوع تک چلا گیا ہے۔ گویا مسلسل دس رکوع بنی اسرائیل سے براہِ راست گفتگو پر مشتمل ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے ابتدائی چار رکوع تمہیدی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو رُکوعوں میں تین قسم کے افراد کا ذکر آیا ہے اور پھر قرآن کریم کی بنیادی دعوت کا خلاصہ دو رُکوعوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ وہاں بھی اگر چہ بین السطور یہود کا ذکر موجود ہے تاہم ان سے براہِ راست خطاب نہیں ہے۔

پھر پانچویں رکوع سے یہود کے ساتھ براہِ راست خطاب کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پندرہویں رکوع تک چلا گیا ہے۔ اس میں یہود یعنی بنی اسرائیل کو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی مؤثر دعوت بھی ہے اور اُن پر ایک نہایت مفصل قراردادِ جرم بھی عائد کی گئی ہے' اس لئے کہ ان کی حیثیت سابقہ اُمّتِ مسلمہ کی تھی۔ یہود اڑھائی ہزار برس تک اس منصب پر فائز رہے' نبوت و رسالت کا سلسلہ ان کے یہاں لگاتار جاری رہا' آسمانی کتابیں اُنہیں عطا کی گئیں۔ اس پورے عرصے کے دوران شریعتِ الٰہی کے وہ حامل رہے۔ یوں کہئے کہ وہ اڑھائی ہزار برس تک اللہ کی زمین پر اللہ کی نمائندہ اُمت تھے۔ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی جو ناقدری کی' شریعتِ الٰہی کو جس طرح بازیچۂ اطفال بنایا' اللہ کی کتاب میں جس جس طرح سے تحریف کی' وہ دنیا پرستی میں جس طرح غرق ہوئے اور دین کا جو حلیہ انہوں نے بگاڑا' اس سب کا ذکر کر کے گویا یہ اعلان فرما دیا گیا کہ انہیں ان کے منصبِ جلیلہ سے معزول کیا جا رہا ہے اور ان کی جگہ ایک نئی اُمّت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر برپا کی جا رہی ہے۔ یہ ہے وہ مضمون کہ جس کے لئے سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع میں اگر چہ یہود کے لئے دعوتی انداز بھی ملتا ہے لیکن پھر دسویں رکوع تک ملامت کا رنگ غالب ہے' ان کے جرائم کی طویل فہرست کا بیان ہے' بلکہ یوں کہئے کہ ایک مفصل قراردادِ جرم ہے جس کے نتیجے میں وہ اس مقام و مرتبے سے محروم اور اس عظیم منصب سے معزول ہوئے جس پر وہ اڑھائی

ہزار برس تک فائز رہے اور اب اُمتِ مسلمہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس مقام پر فائز کی گئی ہے۔

چنانچہ پندرہویں رکوع سے لے کر اٹھارہویں رکوع تک' ان چار رکوعوں میں اسی اہم تبدیلی کی جانب اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان رکوعوں میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی شخصیت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے کہ جو بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے جدّ امجد تھے اور اس اعتبار سے دونوں کے نزدیک یکساں طور پر محترم تھے۔ پھر ان رکوعوں میں خانہ کعبہ کی تعمیر کا باہتمام ذکر آیا ہے اور بوقتِ تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا کا ذکر ہے کہ اے پروردگار! ہماری نسل میں سے ایک اُمّت برپا کیجیو اور ان میں اپنا ایک نبی مبعوث فرمائیو! اس دعا کا ذکر پندرہویں رکوع میں ہے۔ اور پھر گویا کہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب وہ اُمت برپا ہوگئی ہے اور اُس نبی کی بعثت ہوگئی ہے جس کے لئے حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند اسماعیل (علیہما السلام) نے دعائیں مانگی تھیں۔ اب اس نبی کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر ایک اُمّت وجود میں آ چکی ہے جسے ایک نہایت بلند منصب عطا کیا گیا ہے۔ چنانچہ سترہویں رکوع میں وہ آیۂ مبارکہ آئی جس میں نئی اُمّت کی تشکیل کا ذکر ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''اور اسی طرح بنایا ہے ہم نے تمہیں ایک درمیانی اُمت (ایک بہترین اُمت) تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر گواہ بن جائیں''۔

نئی اُمّت کیوں تشکیل دی گئی؟

سورۃ الحج کے آخری رکوع میں یہی مضمون ایک دوسری ترتیب سے آیا تھا کہ اے مسلمانو! اپنے نصیب پر فخر کرو کہ اس نے تمہیں ایک اہم منصب کے لئے چن لیا ہے' پسند کرلیا ہے۔ ﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ تم نبوت و رسالت کے سلسلے میں ایک مستقل کڑی کی حیثیت سے شامل کر لئے گئے ہو۔ یہ سب کچھ کس لئے ہے؟ ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ

شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ ''تاکہ رسول تم پر گواہ بن جائیں اور تم پوری نوعِ انسانی پر دینِ حق کی گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ گویا دونوں مقامات پر ایک ہی مضمون مختلف ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ شہادت علی النّاس کا مضمون سورۃ الحج کے درس کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ آ چکا ہے۔ پھر انہی رکوعوں میں دو مرتبہ وہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی طریق کار کا بیان ہے۔ پہلے تو پندرہویں رکوع میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں وہ الفاظ وارد ہوئے اور پھر اٹھارہویں رکوع میں جہاں اس دعا کی قبولیت کا اعلان ہے وہاں یہ الفاظ اس شان کے ساتھ آئے:

﴿ كَمَا اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ...... ﴾

گویا کہ اُمّتِ مسلمہ کے مقصدِ وجود اور اس کی غرضِ تاسیس کا نمایاں انداز میں ذکر سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑی ہی اہم اور قابلِ توجّہ بات ہے' اس لئے کہ چھوٹی سی انجمن بھی اگر بنائی جاتی ہے تو آغاز ہی میں اس کے اغراض و مقاصد معیّن کئے جاتے ہیں کہ یہ ادارہ کیوں تشکیل دیا جا رہا ہے اور کون سا اہم کام ہے جو اس کے پیشِ نظر ہے' اس انجمن کی غرضِ تاسیس کیا ہے؟ وغیرہ۔ سوچئے کہ اتنی بڑی اُمّت اگر تشکیل دی گئی ہے تو لازماً اس کے بھی کچھ اغراض و مقاصد ہوں گے۔ یہی درحقیقت اس آیت کا موضوع ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل لفظ ''اُمَّة'' کے مفہوم پر بھی غور کیجئے: اَمَّ ۔یَؤُمُّ کے معنی ہیں قصد کرنا' ارادہ کرنا۔ اُمت سے مراد ہے ہم مقصد لوگوں کا ایک گروہ یا ایک جماعت۔ ایک مشترک نصب العین رکھنے والے اور ایک ہی ہدف اور منزلِ مقصود رکھنے والے لوگ اُمّت قرار پاتے ہیں۔ اس پس منظر میں سمجھئے کہ مسلمانوں کو اُمّت اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ فریضۂ نبوت اور کارِ رسالت جو پہلے انبیاء و رُسل ادا کیا کرتے تھے اب ختمِ نبوّت کے بعد قیامت تک یہ ذمہ داری اس اُمت کو ادا کرنی ہے۔ لوگوں تک اللہ کے

دین کو پہنچانے کا فریضہ اب اس اُمت کے حوالے کیا گیا ہے۔اسی فریضے کا عنوان ہے ''شہادت علی الناس'' اور ''اتمامِ حجّت'' کہ اپنے قول وفعل سے دینِ حق کی گواہی دینا اور اللہ کی طرف سے خلقِ خدا پر حجّت قائم کر دینا تاکہ محاسبۂ اُخروی کے وقت وہ یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ اے اللہ تیری ہدایت ہم تک پہنچی نہیں' ہمیں معلوم نہ تھا کہ تُو کیا چاہتا ہے' ہمیں بتایا ہی نہیں گیا کہ تیری مرضی کس چیز میں ہے! سورۃ النساء میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۝﴾ (آیت ۱۶۵)

''تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں کوئی دلیل اور حجت باقی نہ رہے' اور اللہ تو ہے ہی سب پر غالب' کمالِ حکمت والا''۔

تو سورۃ البقرۃ کے پندرہویں رکوع سے لے کر اٹھارہویں رکوع تک یوں سمجھئے کہ وہی مضامین جن کا مطالعہ ہم سورۃ الحج' سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعۃ میں بڑی تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں' یہاں ایک ذرا مختلف ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ خاص طور پر اُمت کے فرضِ منصبی کے حوالے سے ان سب مضامین کو بیان کرنے کے بعد اب خطاب شروع ہوتا ہے مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمّتِ مُسلمہ' کہ اپنے فرائض کی عظمت کو پہچانو' ایک بڑا کٹھن اور نہایت بھاری بوجھ ہے جو تمہارے کاندھے پر آ گیا ہے۔اس پہلو سے یہ مقام سورۃ المُزّمّل کی ابتدائی آیات کے بہت مماثل ہے کہ جہاں آنحضور ﷺ کو آغازِ وحی کے بالکل ابتدائی دَور میں شخصی طور پر خطاب کر کے کچھ خصوصی ہدایات دی گئیں اور پیشگی آگاہ کر دیا گیا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا۝﴾ ''(اے نبی!) ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں''۔ کارِ رسالت کی بھاری ذمہ داری آپؐ کے کاندھوں پر ڈالی جا رہی ہے۔ چنانچہ اسی موقع پر یہ تلقین بھی کی گئی کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا۝﴾ کہ ان مخالفین کی

باتوں پر آپ صبر کیجئے اور استقامت کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی پر کمر بستہ رہیے اور ان مخالفین کو خوبصورتی کے ساتھ نظر انداز کر دیجئے!

اُمّت سے پہلا باضابطہ خطاب

اب کارِ رسالت کا یہ بوجھ چونکہ اُمت کے کاندھوں پر آ رہا ہے' یہ اجتماعی ذمّہ داری ہے جو اُمّت کو تفویض کی جا رہی ہے لہٰذا اُمت سے خطاب اِن الفاظ میں ہوا:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط﴾

''اے اہل ایمان! مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے''۔

حکم ہو رہا ہے کہ دعوت و تبلیغ دین کی اہم ذمہ داری اور فریضۂ شہادت علی الناس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قوّت پکڑو صبر و ثبات سے' سہار اور تحمل سے اور نماز سے کہ جو اللہ کے ذکر کی ایک اعلیٰ شکل اور اس کے ساتھ ایک مضبوط تعلق قائم رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

اگرچہ اس سے پہلے ہمارے اس منتخب نصاب میں ﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ متعدد بار آ چکے ہیں' یہاں تک کہ صرف سورۃ الحجرات میں پانچ مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں' لیکن یہاں ان الفاظ کے حوالے سے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم کا یہ وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمّتِ مُسلمہ گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے۔ اُمت کی تشکیل کے اعلان کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں کو باضابطہ خطاب کیا گیا اور اس کے لئے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ لائے گئے۔ یہ بات بہت سے حضرات کے لئے شاید قابلِ تعجب ہو کہ پورے مکّی قرآن میں کہیں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ نہیں آئے۔ قرآن مجید کا قریباً دو تہائی حصّہ مکّی سورتوں پر مشتمل ہے اور پورے مکّی قرآن میں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے خطاب نہیں ملتا۔ اس قاعدے میں استثناء صرف ایک ہے اور وہ سورۃ الحج کا وہی مقام ہے جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے' لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اس سورۃ کے مکّی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف چلا آ رہا ہے۔ بہت سے حضرات اسے مدنی مانتے

ہیں اور اس کی بعض آیات کے بارے میں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مدنی دَور میں نازل ہوئیں۔ وہ یقیناً یا تو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں یا اثنائے سفرِ ہجرت میں ان کا نزول ہوا۔ اس پہلو سے یہ استثناء بھی باقی نہیں رہتا اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پورے مکّی قرآن میں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ نہیں آئے۔

آیتِ زیرِ نظر سے قبل سورۃ البقرۃ میں اگرچہ صرف ایک مرتبہ یعنی آیت ۱۰۴ میں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ وارد ہوئے ہیں لیکن وہ بھی ایک ضمنی بات کے طور پر، اصل میں مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمّتِ مُسلمہ خطاب شروع ہو رہا ہے سورۃ البقرۃ کی اس آیت ۱۵۳ سے۔ اس کے بعد مدنی سورتوں میں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا اندازِ خطاب نہایت کثرت سے ملتا ہے۔ مکّی قرآن میں خطاب جہاں بھی ہے وہ براہِ راست محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے ہے، بصیغۂ واحد۔ ہاں تبعاً آپؐ کی وساطت سے مسلمان بھی اس خطاب کے مخاطب ہوتے ہیں، لیکن قرآن حکیم میں مسلمانوں کو بحیثیتِ اُمّت خطاب کا آغاز مدینے میں آ کر ہوا کہ جہاں مسلمان ایک اُمت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور تشکیلِ اُمت کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا تھا۔ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اگرچہ مکّے میں بھی ان کی حیثیت ایک جماعت کی اور ایک Revolutionary party کی تھی لیکن ان کی بحیثیت اُمّتِ مسلمہ باقاعدہ تاج پوشی (Coronation) مدینے میں ہوئی اور اس کی علامت کے طور پر تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہوا۔ دوسرے پارے کے بالکل آغاز میں یہ حکم وارد ہوا کہ تمہارا قبلہ بدل دیا گیا ہے، آئندہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ نہیں ہوگا بلکہ ﴿فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہ اب پھیر لو اپنے چہروں کو مسجدِ حرام کی جانب۔ ایک نئے مرکز کے گرد ایک نئی اُمت کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا اور اسی اعتبار سے اب قرآن مجید میں مسلمانوں سے خطاب کے لئے مستقل اصطلاح ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔

ایک نئے دورِ آزمائش کا آغاز

بہر حال اس مرحلے پر یہ آیات ایک پیشگی تنبیہ کا درجہ رکھتی ہیں کہ مسلمانو! یہ نہ

﴿اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ﴾

''(اے نبی!) تلاوت کرتے رہئے جو وحی کیا گیا آپ کی طرف کتاب میں سے اور نماز قائم کیجئے۔ یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے''۔

یہی بات ہم سورۂ بنی اسرائیل میں دیکھ چکے ہیں۔ وہاں پر بھی فرمایا گیا کہ اے نبی! اگر چہ جو مصالحانہ پھندے آپ کے لئے لگائے گئے آپ اللہ کے فضل و کرم سے ان سے بچ نکلے' لیکن صبر و ثبات کے لئے بنیاد وہی اقامتِ صلوٰۃ ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ﴾ (آیت ۷۸)

''قائم رکھئے نماز کو سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا''

اور سورۃ العنکبوت میں تلاوتِ قرآن حکیم اور اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کے ساتھ ہی فرمایا:

﴿وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ''اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی شے ہے''۔ اور تلاوتِ قرآن حکیم اور اقامتِ صلوٰۃ اللہ کے ذکر اور تعلق مع اللہ کی بہترین صورتیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ کسی بھی انقلابی کارکن کے لئے اپنی انقلابی جدوجہد میں ثابت قدم رہنے کا دارومدار اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ پوری یکسوئی کے ساتھ وابستگی اور لگاؤ پر ہے۔ اپنے نصب العین سے اس کی وابستگی جس قدر گہری ہوگی' ذہن اور قلب کے اندر اس کی جڑیں جتنی گہری اتری ہوئی ہوں گی' اسی قدر وہ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرے گا' مصائب کو جھیلے گا' امتحانات میں کامیابی سے درّاتا ہوا گزر جائے گا اور آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے سرخرو ہو کر نکلے گا۔ یہ جدّ وجُہد چونکہ اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کے لئے ہے اور اس میں اصل مقصود و مطلوب اللہ کی رضا جوئی ہے لہٰذا یہاں تمہارے صبر و ثبات کی بنیاد تعلق مع اللہ ہے۔ اللہ کی یاد تمہارے دل میں جس قدر رہوگی اور اللہ تمہارے ذہن سے جتنا قریب تر رہے گا اتنا ہی تم اس راہ میں ثابت قدم رہ سکو گے۔ اور ذکر اللہ کے لئے جو سب سے جامع پروگرام تمہیں دیا گیا وہ ہے نماز۔ چنانچہ یہاں فرمایا گیا:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾
''اے اہلِ ایمان! مدد چاہو صبر سے اور نماز سے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اللہ کی معیّت اور نصرت کے اصل حق دار کون؟

یہ معیّت تائید و نصرت کے معنی میں ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی ایک معیت تو وہ ہے جو ہر شے کو حاصل ہے' کیونکہ اللہ ہر جگہ ہر آن موجود ہے۔ ﴿ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ﴾ ''جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے''۔ ان الفاظ میں اللہ کی معیتِ عمومی کا ذکر ہے' لیکن اہلِ ایمان کو اللہ کی جو معیت حاصل ہوتی ہے وہ ہے اللہ کی تائید و نصرت' اس کی طرف سے توفیق و تیسیر' اس کی طرف سے ہمت کا بندھے رہنا اور بشارتوں کا ملتے رہنا۔ یہاں اسی معنی میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾

کہ یاد رکھو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے! اس کی یہ معیت ان لوگوں کو حاصل نہیں ہے جن میں مصائب جھیلنے اور مشکلات برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں' جو تھڑ دلے بزدل اور کم ہمت لوگ ہیں' جن کا نقشہ سورۃ النساء میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَا اِلٰی ھٰٓؤُلَاءِ وَلَا اِلٰی ھٰٓؤُلَاءِ ط﴾ (آیت ۱۴۳)

جن کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا کو بھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا' یہاں کی لذات سے کنارہ کشی بھی کسی درجے میں گوارا نہیں ہے' مال و اولاد اور تعیّشات کی محبتیں بھی دل کے اندر گہری موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دین کی طرف بھی رغبت ہے۔ ایسے لوگ کسی طرح کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ تائیدِ ربانی اور توفیقِ الٰہی تو انہی لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے جو یکسو ہو کر آئیں' جن کے بارے میں پہلے عرض کیا گیا کہ جو ''ہر چہ بادا باد' ما کشتی در آب انداختیم'' کے سے جذبے کے ساتھ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ کی معیت اور توفیق و تائید حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ العنکبوت کی آخری آیت بھی ہم پڑھ آئے ہیں:

﴿وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾
''اور جن لوگوں نے ہماری خاطر جدوجہد کی ہم لازماً انہیں اپنی راہیں سجھا دیں گے' اور یقیناً اللہ تو احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اللہ کی تائید اور توفیق ہر دم اُن کے شامل حال رہتی ہے۔

اسی معیّتِ خداوندی کا ایک ظہور ہمارے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے اور پیچھے سے فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب شروع کیا تو ایک مرحلہ وہ آیا کہ بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا' سامنے سمندر تھا اور پیچھے نظر آ رہا تھا کہ فرعون اور اس کا لشکر چلا آ رہا ہے' گرد اڑاتا ہوا قریب سے قریب تر پہنچ رہا ہے۔ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے عالمِ بے چارگی میں کہا: ﴿اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ﴾ ''(اے موسیٰ!) ہم تو پکڑے گئے (اب تو بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے)''۔ اُس وقت حضرت موسیٰ نے کمالِ دلجمعی کے ساتھ جواب دیا: ﴿کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ﴾ ''نہیں نہیں! میرے ساتھ میرا ربّ ہے' وہ یقیناً مجھے راستہ دے گا''۔ چاہے بظاہر احوال کوئی راستہ نہیں' مادی اسباب و وسائل راستہ روکے کھڑے ہیں' لیکن میرا توکل و انحصار اور میرا تکیہ اور دار و مدار اُس ذات پر ہے جو مسبّب الاسباب ہے' جو اسباب سے ماوراء ہے' وہ یقیناً راستہ نکال دے گا۔ یہی بات غارِ ثور میں حضور ﷺ نے فرمائی تھی۔ جب بر بنائے طبع بشری حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی کچھ گھبرا گئے تھے کہ حضور! یہ لوگ غار کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں اور اگر ان میں سے کسی نے غیر ارادی طور پر بھی اپنے قدموں کی طرف نگاہ ڈال لی تو ہم پکڑے جائیں گے۔ اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا﴾ ''نہیں نہیں' گھبراؤ نہیں' اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔ تو یہ ہے مفہوم ﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ کا۔ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ معیتِ الٰہی کا مقام ہے' یہ درحقیقت بندۂ مؤمن کا آخری سہارا ہے ان حالات میں بھی کہ جہاں کوئی حالت اُمید افزا نظر نہ آ رہی ہو' جہاں کہیں کوئی راستہ نکلتا

ہوا دکھائی نہ دے رہا ہو اور امید کی کوئی کرن کسی جانب سے نظر نہ آتی ہو۔ معیتِ خداوندی کا یہ یقین اور اللہ کی تائید و نصرت پر یہ بھروسہ ایک ایسی شے ہے جو بندۂ مؤمن کو اس طرح کے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی ثابت قدم رکھتی ہے اور وہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی جاری رکھتا ہے' نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے جو کچھ اس کے بس میں ہوتا ہے وہ کیے چلے جاتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر اُمّت کو اس کے فرضِ منصبی سے آگاہ کرنے اور وہ کٹھن ذمہ داری جو اُس کے کاندھے پر آ رہی ہے اس سے مطلع فرمانے کے بعد جو پہلی ہدایت دی گئی وہ یہی ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۝﴾

اس کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝﴾

''اور مت کہو ان کو جو قتل ہو جائیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں' بلکہ وہ تو زندہ ہیں' لیکن تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں ہے''۔

یہ مضمون سورۂ آلِ عمران میں بڑے مؤکّد انداز میں پھر دہرایا گیا ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾ (آیات ۱۶۹۔۱۷۱)

''اور ہرگز گمان نہ کرنا ان کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مُردہ ہیں' نہیں وہ زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں' فرحاں و شاداں ہیں اس (انعام و اکرام) سے کہ جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا فرمایا اور خوش خبریاں حاصل کر رہے ہیں ان لوگوں کے بارے میں کہ جو ابھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے ان کے پیچھے سے' کہ نہ ان پر کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوشخبری حاصل کر رہے ہوں گے اللہ کے انعام اور اس کے

فضل پر' اور اللہ تعالیٰ مؤمنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

قرآن میں لفظ ''شہید'' کا استعمال

یہاں ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف توجّہ دلا دینا یقیناً مفید ہوگا کہ قرآن حکیم میں اگرچہ لفظ شہید کا استعمال متعدّد مقامات پر ہوا ہے اور ''شہادت'' قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے لیکن مقتول فی سبیل اللہ کے لئے قرآن لفظ ''شہید'' استعمال نہیں کرتا۔ اس میں استثناء صرف ایک ہے اور وہ ہے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰۔ وہاں ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ میں لفظ ''شُهَدَاءَ'' کو اگر مقتولین فی سبیل اللہ کے معنیٰ میں لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دیگر تمام مقامات پر مقتول فی سبیل اللہ کے لئے اس لفظ کا استعمال ہمیں قرآن میں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورۂ آل عمران میں جہاں یہ مضمون آیا ہے وہاں بھی شہید ہو جانے یا شہادت پا جانے کے لئے ''قُتِلَ'' کا لفظ ہی صیغۂ مجہول میں آیا ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴۴)

''محمد (ﷺ) اللہ کے ایک رسول ہیں' ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں' تو اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے؟''

ایک حدیث میں جس میں آنحضور ﷺ نے اپنے لئے شہادت کی تمنّا کا اظہار فرمایا ہے' وہاں بھی اس ضمن میں ''قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ'' کے الفاظ ہی وارد ہوئے ہیں:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ' فَاُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ)) (رواہ البخاریؒ عن ابی ھریرہؓ)

''اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میری دلی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر مقتول ہو جاؤں (اللہ کی راہ میں) اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر قتل کر دیا جاؤں۔''

ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں لفظ شہادت کا استعمال اصلاً دین حق کی گواہی

دینے کے لئے ہے۔ اللہ کے خالق و مالک ہونے کی گواہی' اللہ کی توحید کی گواہی' محمد ﷺ کی صداقت اور رسالت کی گواہی۔ (ع دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی) آخرت کے حق ہونے کی گواہی' خیر کی گواہی' قرآن کی حقانیت کی گواہی —— اور یہ گواہی صرف اپنے قول سے ہی نہیں عمل سے بھی دینی ہے۔ یہ ہے ہر مسلمان کا فرض اور اس کے لئے قرآن کی اصطلاح ہے ''شہادت علی الناس'' جو تمام مسلمانوں کا فرضِ منصبی ہے بحیثیتِ اُمّتِ مُسلمہ۔ اس لفظ شہادت کو قرآن مجید نے اس معنی کے لئے خاص کیا ہے۔ تاہم احادیث میں مقتول فی سبیل اللہ کے لئے لفظ شہید کا استعمال بھی مل جاتا ہے۔ اس لئے ان دونوں الفاظ میں اس اعتبار سے ایک گہرا معنوی ربط موجود ہے کہ جس شخص نے حق کے غلبے کی اس جدّوجُہد میں اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دی اس نے گویا کہ آخری درجے میں شہادت دے دی' دین کی خاطر اپنی زندگی دے کر گویا اپنی جان سے دینِ حق کی گواہی دے دی۔ اب وہ شہید (گواہ) کہلانے کا بتمام و کمال مستحق ہو گیا۔

شہداء کی برزخی حیات!

آیت کے آخری ٹکڑے میں شہداء کی زندگی کے بارے میں ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ کے الفاظ میں ہمارے لئے بڑی اہم رہنمائی مضمر ہے۔ شہداء کو اللہ جس نوع کی حیات عطا فرماتا ہے اور برزخی زندگی میں بھی جس طور سے انہیں رزق مہیّا فرماتا ہے اس تک ہمارے فہم وادراک کی رسائی نہیں ہے' اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ بدقسمتی سے برزخی زندگی کے حوالے سے مسلمانوں میں ایک مذہبی بحث (Controversy) نے بڑے ہی شدّت اختیار کی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں ایک بڑی بنیادی رہنمائی ہمیں اس آیت سے ملتی ہے۔ وہ بحث یہ ہے کہ عالمِ برزخ میں نبی اکرم ﷺ کی حیات کی نوعیت کیا ہے' اپنی قبر شریف میں آنحضور ﷺ کس حال میں ہیں!! یہ مسئلہ ہمارے مذہبی حلقوں میں نا معلوم کیونکر بحث وتمحیص' قیل وقال اور ردّ وقدح کا موضوع بن گیا! حالانکہ ہمیں یہ بات اچھی طرح

معلوم ہے اور یہ قرآن حکیم کی بنیادی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے کہ موت خاتمے کا نام نہیں ہے' نہ کسی مؤمن کے لئے نہ کافر کے لئے۔ اِدھر آنکھ بند ہوتی ہے تو دوسرے عالم میں کھل جاتی ہے۔ یہ عالم برزخ ہے جس کا تسلسل قیامت تک رہے گا۔

اس برزخی دَور میں ایک نوع کی حیات تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اس برزخی حیات کا مرحلہ کافروں کے لئے بھی ہے اور مؤمنین کے لئے بھی' تاہم زندگی کی کیفیات مختلف ہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر قبر یا تو جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ یہاں قبر سے مراد مٹی کا وہ ڈھیر نہیں جس کے نیچے انسان مدفون ہوتا ہے' بلکہ یہاں یہ اپنے وسیع تر مفہوم میں ہے اور اس سے مراد عالمِ برزخ ہے۔ چنانچہ خواہ کوئی شخص سمندر میں غرق ہو کر مرا ہو عالمِ برزخ میں وہ ایک خاص کیفیت سے گزرتا ہے' اس کے آخری انجام کا ایک عکس پڑتا رہتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ابوجہل یا ابولہب کے ساتھ عالم برزخ میں جو معاملہ ہو رہا ہے وہ کچھ اور ہے اور کوئی مسلمان عالم برزخ میں جس کیفیت سے گزر رہا ہے وہ کچھ اور ہے' کوئی مؤمن صالح وہاں کسی اور کیفیت میں ہوگا' شہداء کا کچھ اور عالم ہوگا اور صِدّیقین کی شان کچھ اور ہوگی' انبیاء و رُسل کا مرتبہ و مقام کچھ اور ہوگا اور سیّد المرسلین' سیدالاولین والآخرین ﷺ اس عالم برزخ میں جس شان میں ہوں گے وہ ہمارے فہم اور تصوّر سے ماوراء ہے' بلکہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ جب ہم شہداء کی برزخی زندگی کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے اور اس کی نوعیت کا تعین نہیں کر سکتے' جیسا کہ قرآن نے صاف طور پر کہہ دیا ہے: ﴿وَلٰـكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ کہ تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں ہے تو نبی اکرم ﷺ کی برزخی حیات کے بارے میں کوئی تصور کرنا ہمارے لئے قطعاً ناممکن ہے۔ یہ چیز ہمارے فہم و شعور اور تخیل و ادراک کی گرفت میں آنے والی ہے ہی نہیں۔ اس معاملے میں بحث کرنا ہی دراصل اپنی حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ کہنا کہ حضور ﷺ بالکل اسی طرح زندہ ہیں جیسے کہ اس دنیا میں زندہ تھے' ایک اعتبار سے شاید آپؐ کی توہین قرار پائے' اس لئے کہ یہ دنیا کی زندگی تو بہت سی احتیاجات کے ساتھ

ہے' اس میں طرح طرح کی تحدیدیں ہیں' عالم برزخ میں نبی اکرم ﷺ کو جو حیات حاصل ہے وہ یقیناً اس سے کہیں اعلیٰ' کہیں ارفع ہے' جو ہمارے فہم اور ہماری سوچ سے بہت بلند اور بالا ہے۔ بہر حال اس معاملے میں خواہ مخواہ کسی چیز کو معیّن کر کے اس پر جھگڑنا اور اس کی بنیاد پر ''مَن دیگرم تُو دیگری'' کے انداز میں تفریق پیدا کر لینا درحقیقت بڑی ہی نادانی کی بات ہے۔

ابتلاء وآزمائش — اس راہ کی شرطِ لازم

اب آیئے اصل سلسلۂ کلام کی طرف۔ اگلی آیت میں وہ پیشگی تنبیہہ آ رہی ہے جس کا حوالہ گفتگو کے آغاز میں دیا گیا تھا:

﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾

''اور (اے مسلمانو!) ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور مال و جان اور ثمرات کے نقصان سے۔''

اس سے قبل سورۃ العنکبوت کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان میں یہ تاکید کا انتہائی اسلوب ہے کہ فعل مضارع سے قبل لام مفتوح اور آخر میں نون مشدّد کا اضافہ کر دیا جائے۔ یہی انداز ہمیں اس آیت میں ملتا ہے۔ چنانچہ ''وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ'' کا ترجمہ ہوگا: ''ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں''۔ ہم آزمائشوں کی کٹھالیوں میں تمہیں ڈالیں گے' تمہارے صبر و مصابرت کا بھرپور امتحان ہوگا' نہایت کٹھن حالات سے تمہیں گزرنا ہوگا جن کے ذریعے جانچ لیا جائے گا کہ تم کتنے پانی میں ہو' یہ بات خوب نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ ذاتِ باری تعالیٰ پر فی الواقع تمہیں کتنا یقین حاصل ہے' حیات بعد الممات پر کتنا پختہ ایمان ہے' محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر تم کیا کچھ قربان کر سکتے ہو۔ اللہ کی راہ میں اگر تم آئے ہو تو تحفظات (Reservations) کے ساتھ تو نہیں آئے! آزمائشوں اور امتحانات سے جب تمہیں سابقہ پیش آئے گا تو ان میں سے ایک ایک چیز واضح ہو جائے گی۔

''بَلَا یَبْلُوْ'' کے معنی ہیں جانچنا اور پرکھنا۔ یہ لفظ لغت میں بنیادی طور پر گوشت کو آگ پر سینکنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس سینکائی کے عمل میں گوشت کو انگاروں پر الٹا پلٹا جاتا ہے' ابھی اس رخ پر ڈالا ہے' پھر ذرا پلٹ کر دوسرے رخ پر ڈال دیا۔ یہ ہے اس لفظ کی اصل۔ تمہیں بھی مختلف حالات سے دوچار کر کے سینکا جائے گا' تمہیں آزمایا جائے گا' جانچا اور پرکھا جائے گا۔ البتہ اس آیت مبارکہ میں ''بِشَیْءٍ'' کا ایک لفظ ایسا آیا ہے جس میں تسلی کا پہلو موجود ہے کہ بظاہر تو امتحانات بڑے کٹھن ہوتے ہیں' ایک بار تو انسان دہل کر رہ جاتا ہے' لیکن اگر وہ ثابت قدم رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بظاہر ایک خوفناک صورت حال سامنے آتی ہے لیکن اگر انسان ڈٹا رہے تو پتہ چلتا ہے کہ بس ایک ریلا تھا حالات کا' آیا اور گزر گیا۔ دیکھنے والے اس آزمائش کی ظاہری شدت سے متاثر اور مرعوب ہوں گے لیکن صبر و ثبات کے ساتھ اس آزمائش سے گزرنے والوں کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے بڑی ہی ہلکی سی کوئی بات تھی کہ جو ہوگئی۔ ﴿بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ﴾

ذہن میں رکھئے کہ یہ آیات مدنی دَور کے بالکل آغاز میں نازل ہو رہی ہیں۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری دس سالوں پر جو آپؐ نے مدینہ میں گزارے' اگر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو اس آیت کی عظمت کا مزید انکشاف ہوتا ہے کہ اس پورے مدنی دَور میں کس طرح وہ حالات وقفے وقفے سے پیدا ہوتے رہے جن کا پورا نقشہ ایک پیشگی تنبیہہ کے طور پر ان آیات میں کھینچ دیا گیا ہے۔ خوف و خدشات ہوں گے' جان و مال کے اندیشے ہوں گے' بھوک اور پیاس سے سابقہ پیش آئے گا' فاقہ کشی کے باعث جان نکلتی ہوئی محسوس ہوگی' جان و مال اور ثمرات کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس راہ میں یہ سارے مراحل آئیں گے۔

لفظ ''ثمرات'' کا وسیع تر مفہوم

''ثمرات'' کا لفظ یہاں بہت ہی قابل توجہ ہے۔ ثمرات کا عام مفہوم لیا گیا ہے پھل۔ اس اعتبار سے ترجمہ یہ بنتا ہے کہ پھل ضائع ہو جائیں گے۔ مدینہ منورہ کے

مخصوص معاشرتی پس منظر میں یہ مفہوم بجا طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ اہل مدینہ بنیادی طور پر کاشتکار تھے' زراعت ان کا پیشہ تھا۔ زراعت کے میدان میں جو محنت بھی کی جاتی ہے' ہل چلایا جاتا ہے' کھیت کی آ ۔ ۔ کی جاتی ہے' اس ساری محنت کا حاصل چونکہ وہ فصل ہے جو آخر میں کاٹی یا اتاری جاتی ہے اور تمام امیدیں چونکہ اس فصل کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں لہٰذا اگر فصل اجڑ جائے تو نقصان بہت شدید ہوتا ہے اور یہ آزمائش کی بڑی کٹھن صورتوں میں سے ایک ہے۔ غزوۂ احزاب اور غزوۂ تبوک کے مواقع پر اس نوع کے امتحان سے مسلمانوں کو سابقہ پیش آیا تھا۔ فصلیں تیار ہیں' لوگ اس امید میں ہیں کہ فصلیں اتاریں گے' اپنی محنتوں کی کمائی کو گھروں میں لائیں گے' عین اُس وقت حملہ ہوتا ہے' باغات اجاڑ دیے جاتے ہیں یا حکم ہوتا ہے کہ تیار فصلوں کو چھوڑ کر جہاد کے لئے نکلو' اور وقت پر فصلیں برداشت نہ کر سکنے کے باعث فصل ضائع ہو جاتی ہے۔ یہ تمام آزمائش کی صورتیں ہیں جن سے مسلمان مدینہ میں گزرتے رہے ہیں۔ البتہ ''ثمرات'' کا لفظ اس سے زیادہ وسیع ہے۔ انسانی محنت خواہ کسی بھی میدان میں ہو' اس کا حاصل دراصل اس کا ثمرہ ہے۔ کسی نے بڑی محنت کر کے کاروبار جمایا ہے' اب دین کی طرف سے پکار آتی ہے کہ آؤ! اور صاف نظر آ رہا ہے کہ دین کی طرف آنے میں کاروبار کا نقصان ہے' تو یہ آزمائش بڑی کڑی ہے۔ ۔

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

وہ محنت سے جمایا ہوا کاروبار پاؤں میں بیڑی بن کر پڑ جاتا ہے۔ کسی نوجوان نے بڑا وقت لگا کر اور بڑی محنت سے کسی کیریئر میں اپنا کوئی مقام حاصل کیا ہے اور اب دین کے تقاضے سامنے آتے ہیں' دین کا تقاضا اس پر واضح ہوتا ہے کہ آؤ اور کھپاؤ اپنے آپ کو غلبہ و اقامت دین کی راہ میں! وہ کیریئر اور وہ Profession اب انسان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسے صاف نظر آ رہا ہے کہ اس طرح اس کی اب تک کی ساری محنت ضائع ہوتی ہے۔

سورۃ الکہف کے ایک مقام سے اگر روشنی حاصل کی جائے تو اولاد بھی انسان کا ثمرہ ہے' یہ بھی درحقیقت ایک اعتبار سے اس کی کمائی ہے۔ انسان کو اگر ایک درخت سے تعبیر کیا جائے تو اس کا پھل اس کی اولاد ہے۔ نگاہوں کے سامنے اگر اس کی اولاد اللہ کی راہ میں قربان ہو رہی ہو تو گویا یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے اس کا ثمر اس کی نگاہوں کے سامنے اجڑ رہا ہے اور یہ آزمائش کی نہایت کٹھن صورت ہے۔ یہاں متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! یہ سارے امتحان اب آئیں گے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾

''اور ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کسی قدر خوف سے' بھوک سے' مال و جان کے نقصان سے' اور ثمرات کے ضیاع سے''۔

آیت کے آخری ٹکڑے پر اپنی توجہ مرکوز کیجیے! فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

''اور (اے نبی!) بشارت دیجیے صبر کرنے والوں کو''۔ (ان کو کہ جو ان تمام آزمائشوں اور مصائب و تکالیف کو پامردی کے ساتھ جھیل جائیں' برداشت کر جائیں)۔

صبر کا قرآنی تصوّر

قرآن حکیم کے مطالعے سے صبر کا جو تصور سامنے آتا ہے اس کی رو سے صبر ہرگز کوئی منفی شے نہیں ہے' بلکہ یہ ایک مثبت جذبہ ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یا کسی نصب العین اور منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو تکالیف آئیں اور اس راہ کی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے میں جو مصائب آئیں انہیں ثابت قدمی کے ساتھ جھیلنا اور برداشت کرنا صبر ہے' جو یقیناً ایک مثبت جذبہ ہے۔ صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنے والے باہمت لوگوں کے بارے میں ہی یہ الفاظ یہاں آئے ہیں:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ''اور (اے نبیؐ!) بشارت دیجیے صبر کرنے والوں کو!''

صبر کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا کوئی شخص اگر میدانِ جنگ میں پامردی اور استقامت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے جان بچانے کے لئے وہاں سے راہِ فرار اختیار کرے گا تو اس کا یہ عمل دراصل اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس کا سب کچھ کیا دھرا ضائع ہو جائے گا' بلکہ سورۃ الانفال میں تو ایسے شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ تو یہاں پیشگی متنبہ کر دیا گیا کہ اس راہ میں آزمائشیں اور مشکلات تو آئیں گی اور ان میں سرخرو وہی ہو سکیں گے جو صبر و ثبات کا مظاہرہ کریں گے۔ اگلی آیت میں ان صبر کرنے والوں کے ایک نہایت اہم وصف کا ذکر ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۝ ﴾

''(وہ صبر کرنے والے کون ہیں؟) وہ لوگ کہ جب بھی کوئی مصیبت اُن پر پڑتی ہے یا کوئی تکلیف انہیں پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں''۔

اسی سورۂ مبارکہ میں ذرا آگے چل کر وہ آیۂ بِرّ ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کے حصۂ اوّل میں شامل ہے۔ وہاں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نیکی کی بحث کا نقطۂ عروج یہی مضمون ہے: ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾ ''اور خصوصاً صبر کرنے والے اور جھیلنے والے جسمانی اذیت کو' فقر اور فاقے کو اور وہ کہ جو عین حالتِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں''۔ یہاں ان صبر کرنے والوں کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ جب بھی انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے' کوئی بپتا ان پر پڑتی ہے تو ان کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہوتا ہے کہ: ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾

بندۂ مؤمن کا نظریۂ حیات

اس آیۂ مبارکہ میں دراصل ایک مسلمان کے نظریۂ زندگی اور تصورِ حیات کی مکمل عکاسی موجود ہے۔ ہمارا تصورِ حیات کیا ہے؟ ہم اللہ کے پاس سے آ رہے ہیں اور اللہ ہی کے پاس واپس لوٹ جائیں گے۔ یہ دُنیوی زندگی ایک سفر ہے' یہ ہرگز ہماری منزل

نہیں ہے۔ یہ ہمارے سفرِ حیات کا ایک عارضی سا وقفہ ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ ہم آئے کدھر سے ہیں اور اپنی اس منزل کا بھی واضح شعور ہمیں ہونا چاہئے جہاں ہمیں جانا ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار اس آیۂ مبارکہ میں ہے کہ ہمارا وجود بھی اللہ کا عطا کردہ ہے اور ہمیں حیات بھی اسی نے عطا کی ہے۔ لہٰذا ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' اللہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ بھی کرے ہمیں قبول ہے۔ اس کی مرضی کے آگے ہمارا سرِ تسلیم خم ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی عطا ہے۔ ع ''ہر چہ ساقئ ما ریخت عینِ الطاف است'' میرے اس پیالے میں میرے ساقی نے جو کچھ ڈال دیا یہ اس کی نگاہِ کرم ہی کے طفیل ہے۔ یہ اس کا عطیہ ہے' لہٰذا دل و جان سے قبول ہے۔ آگے فرمایا:

﴿اُولٰئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ﴾

''یہ ہیں وہ لوگ کہ جن پر اُن کے ربّ کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے''۔

صلوٰۃ ۔ بندے اور ربّ کے مابین دوطرفہ معاملہ

یہاں لفظ ''صَلَوٰات'' بھی خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ یہ صلوٰۃ کی جمع ہے اور اس سے قبل یہ لفظ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کے درس میں آچکا ہے: ﴿وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِھِمۡ یُحَافِظُوۡنَ﴾ ...... ''صلوٰۃ'' جیسا کہ عرض کیا گیا تھا' توجّہ کا نام ہے۔ لغت میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے: ''اِقۡدَامٌ اِلَی الشَّیۡءِ'' یعنی کسی کی جانب متوجہ ہونا' کسی کی طرف رخ کر لینا۔ اسی لئے نماز جس کی اصل روح ہے اللہ کی جانب متوجہ ہو جانا' اس کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے:

﴿اِنِّیۡ وَجَّھۡتُ وَجۡھِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾

صلوٰۃ درحقیقت ایک دوطرفہ عمل ہے جو اللہ اور بندے کے مابین ہے۔ بندہ جذبۂ عبودیت کے ساتھ اپنے ربّ کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور پروردگار شفقت و

عنایت کے ساتھ بندے کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر عبد و معبود کے ربط و تعلق کو ایک دوہرے اور دوطرفہ تعلق کی شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ ہی میں اس مقام سے متصلاً قبل کہ جو ہمارے زیرِ درس ہے' یہ آیت موجود ہے:

﴿فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾

''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر بجالاؤ اور میری ناشکری نہ کرو!''

اس کی بڑی عمدہ وضاحت ایک حدیثِ قدسی سے ہوتی ہے جس کی رُو سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اگر میرا بندہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں' اور اگر میرا بندہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس سے بہت اعلیٰ محفل میں (یعنی ملائکہ مقرّبین کی محفل میں) اس کا ذکر کرتا ہوں''۔ اسی طرح کا معاملہ لفظ توبہ کا بھی ہے۔ بندہ اللہ کی جناب میں پشیمانی اور احساسِ ندامت کے ساتھ رجوع کرتا ہے' گناہ کے راستے سے واپس پھرتا ہے اور اللہ بھی بندے کی طرف متوجّہ ہو جاتا ہے اپنی شفقتوں اور عنایتوں کے ساتھ۔ گویا اس کی وہ نگاہِ کرم جو بندے کی جانب سے ہٹ گئی تھی وہ اب پھر اس کی طرف ملتفت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ''نصرت'' کا معاملہ بھی دوطرفہ ہے: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ یہ صریحاً ایک دوطرفہ معاملہ ہے۔ اسی طرح شکر کے بھی دو رُخ ہیں۔ اللہ بھی شکور ہے اور بندے کے لئے بھی شکور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بندے کا شکور ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ اللہ کا حق مانے' اس کا احسان مانے' اس کی نعمتوں کا حق ادا کرے اور اس کا شکر بجالائے' جبکہ اللہ اس اعتبار سے شکور ہے کہ وہ کوششوں اور قربانیوں کی قدر افزائی فرمانے والا ہے' وہ بڑا قدردان ہے۔ تو ذہن میں رکھئے کہ کچھ اسی طرح کا معاملہ صلوٰۃ کا بھی ہے۔ بندہ اگر اللہ کی طرف متوجّہ ہوگا تو اللہ بھی بندے کی طرف کمال شفقت کے ساتھ متوجہ ہو جائے گا۔ سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں جو الفاظ وارد ہوئے وہ چونکہ بالعموم سیرت کی ہر تقریر کا عنوان

بنتے ہیں' لہٰذا اکثر لوگوں کو یاد ہیں:

۞ اِنَّ اللّٰہ وملٰئکتہٗ یُصلُّوْن علی النّبیّ ؕ یٰاَیُّھا الّذین اٰمنُوْا صلُّوْا علیہِ وسلِّمُوْا تسْلِیْماً ۞

یہاں دیکھئے کہ ''صلوٰۃ'' کی نسبت اللہ اور فرشتوں کی طرف ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں' ان کی جانب سے آپؐ پر شفقتوں اور عنایتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہتا ہے' لیکن نوٹ کیجئے کہ یہ الفاظ صرف نبی اکرم ﷺ کے لئے نہیں آئے بلکہ سورۃ الاحزاب ہی میں بعینہٖ یہی الفاظ اہلِ ایمان کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں:

۞ ھُوالّذِیْ یُصلّیْ علیْکُمْ وملٰئکتُہٗ لیخرجکُمْ مّن الظُّلُمٰت الی النُّوْر ؕ وکان بالْمُؤمنیْن رحیْماً ۞

''وہی ہے اللہ جو (اے اہلِ ایمان!) تم پر عنایتیں بھیجتا رہتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تم پر عنایتیں (درود) بھیجتے ہیں' تا کہ وہ تمہیں نکالے اندھیروں میں سے روشنی کی جانب' اور وہ اہلِ ایمان کے حق میں بہت ہی رحیم ہے''۔

یہ ہے لفظ صلوٰۃ کا قرآن حکیم میں استعمال! یہاں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ﴾ اللہ کی عنایات اور شفقتوں کا نزول ان لوگوں پر ہوتا ہے جو مشکلات اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے والے ہیں' جنہوں نے دین کو محض موروثی عقائد اور چند رسومات کا مجموعہ سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ شعوری طور پر حقائق کو سمجھا' فرائضِ دینی کا شعور حاصل کیا' دین کی دعوت پر لبیک کہا' جنہوں نے اس حقیقت کو جانا کہ دین کے لئے جان و مال کھپانا اور اس کے غلبہ و اقامت کے لئے قربانیوں کا دینا ہمارے ایمان کا عین تقاضا ہے' اور پھر اس راہ کے تمام امتحانوں اور آزمائشوں میں پورے اترے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اُن کے ربّ کی جانب سے عنایتیں ہیں' جن کے لئے شاباشیں ہیں' جن پر اللہ کی رحمتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہے گا۔ اور فرمایا: ﴿وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ﴾ ''اور یہی ہیں وہ لوگ جو راہ یاب ہونے والے ہیں'' جو ہدایت یافتہ ہیں۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں پھر اسلوبِ حصر ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ

صرف یہی لوگ فی الواقع راہ ہدایت پر گامزن ہیں۔

اس سے قبل سورۃ الفاتحہ کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ہدایت کے مختلف مدارج ہیں۔ ایک انسان درجہ بدرجہ ہدایت کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ایک منزل کے بعد اگلی منزل ہے اور ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ ہے۔ گویا ہدایت ایک مسلسل عمل ہے۔ چنانچہ لفظ ہدایت کا اطلاق اپنے تکمیلی معنوں میں کسی کے منزلِ مراد تک پہنچ جانے کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے ﴿وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ کا مفہوم ہوگا: ''یہ ہیں وہ لوگ جو منزلِ مراد تک پہنچ جانے والے ہیں''۔

ان چند آیات میں اہلِ ایمان کو مدنی دَور کے بالکل آغاز میں جن مراحل سے سابقہ پیش آنے والا تھا ان کے بارے میں پیشگی طور پر متنبہ کر دیا گیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو بحیثیتِ اُمّتِ مسلمہ شہادت علی النّاس کا جو فرضِ منصبی سونپا گیا تھا اس کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لئے یہ رہنمائی عطا کر دی گئی کہ جو مرتبہ و مقام تمہیں ملا ہے اس کے تقاضے کے طور پر یہ بات جان لو کہ اس راہ میں مصائب و مشکلات آئیں گی' آزمائشوں میں سے تمہیں گزرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!

حکمِ قتال اور اس کا ہدف

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ سورۃ البقرۃ مدنی سورۃ ہے اور اس کے زمانۂ نزول کا اگر تعین کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک کے عرصے میں نازل ہوئی۔ چنانچہ یہ آیات جو ہمارے زیر درس ہیں گویا کہ قتال فی سبیل اللہ کے لئے تمہید کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر چوبیسویں رکوع میں قتال فی سبیل اللہ کے ضمن میں متعین حکم بھی موجود ہے: ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ﴾ حکم ہو گیا کہ اے اہلِ ایمان اب اللہ کی راہ میں قتال کرو' اور جان لو کہ تمہاری دعوت اب اگلے مرحلے

میں داخل ہو گئی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ الحج میں' جو نزولی اعتبار سے سورۃ البقرۃ سے متصلاً قبل شمار کی جاتی ہے' اذنِ قتال والی آیت آئی ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ قتال کی اجازت اور قتال کا حکم دو مختلف چیزیں ہیں۔ اجازتِ قتال یہ ہے کہ اب تمہیں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہو گئی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ﴾ (آیت ۳۹)

یعنی آج اجازت مرحمت کی جا رہی ہے ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونسی گئی تھی' جن پر مظالم توڑے گئے تھے' جنہیں اُن کے گھر بار سے نکالا گیا تھا' جن پر زندگی کا قافیہ تنگ کیا گیا تھا' لیکن جنہیں اب تک اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی' گویا ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے تھے' جیسا کہ سورۃ النساء میں ایک جگہ فرمایا گیا کہ ان سے کہہ دیا گیا تھا: ﴿کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ﴾ ''اپنے ہاتھ بندھے رکھو''۔ یعنی جھیلو اور برداشت کرو' جس کے لئے ان دروس میں بار بار Passive Resistance کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آج ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے اور انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی نوید بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔

اس کے بعد سورۃ البقرۃ میں حکمِ قتال وارد ہوا:

﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ﴾ (آیت ۱۹۰)

''جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں اب تم ان سے جنگ کرو اللہ کی راہ میں''۔

سورۃ البقرۃ کے چوبیسویں رکوع میں جہاں قتال کا یہ حکم آیا ہے وہاں ساتھ ہی اس کا ہدف بھی معین کر دیا گیا:

﴿وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۱۹۳)

''اور ان سے جنگ کرتے رہو (یہ تلواریں جو اب میان سے نکلی ہیں یہ اب میان میں واپس نہیں جائیں گی) جب تک کہ فتنہ بالکل فرو نہ ہو جائے (اللہ کے باغی جب تک ہتھیار نہ ڈال دیں) اور پورا نظامِ اطاعت اللہ ہی کے لئے

نہ ہو جائے''۔

جب تک اللہ کی زمین پر اسی کا حکم نافذ نہیں ہوتا اور اس کا کلمہ سربلند نہیں ہوتا اُس وقت تک جنگ جاری رہے گی۔ گویا قتال فی سبیل اللہ کا ہدف یہ ہے کہ دین کُل کا کُل اللہ کے لئے ہو جائے' اسی کا جھنڈا سربلند ہو' اسی کی مرضی نافذ ہو' اسی کے حکم کی تنفیذ ہو' مختصراً یہ کہ اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا دین قائم ہو جائے۔ بہرکیف یہ ہے قتال کا باضابطہ حکم جو سورۃ البقرۃ کے چوبیسویں رکوع میں آیا ہے۔

اب ذرا ایک نظر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ پر بھی ڈال لیجئے جس کا حوالہ اس سے پہلے سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کے درس میں دیا جا چکا ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ کسی بھی نظریاتی گروہ یا جماعت میں ہر مزاج اور ہر اُفتادِ طبع کے لوگ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی جماعت میں جہاں کثیر تعداد میں ایسے باہمت لوگ تھے کہ جنہوں نے حکمِ قتال کی آیت کے نزول پر خوشیاں منائیں کہ اب ہمارے ہاتھ کھول دیئے گئے' اب ہمارے لئے دین کی راہ میں سرفروشی کا وقت آ گیا اور ہمیں اب شہادت کے مواقع نصیب ہوں گے' وہاں کچھ وہ بھی ہوں گے کہ جن پر کچھ گھبراہٹ طاری ہوئی ہوگی۔ جن کے لئے یہ نیا مرحلہ جس میں جنگ و قتال سے سابقہ تھا' شاید زیادہ ہی کڑی آزمائش بن گیا ہو۔ ایسے لوگوں سے صاف کہہ دیا گیا: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ ''کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ تم (سیدھے سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے'' ﴿وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط﴾ ''حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات آئے ہی نہیں (وہ آزمائشیں' وہ کٹھنائیاں اور وہ مشکلات ابھی آئی ہی نہیں) کہ جو تم سے پہلی اُمتوں کو پیش آئے تھے''۔ ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا﴾ ''فقر و فاقہ اور تکالیف ان پر مسلط ہو گئیں اور وہ ہلا مارے گئے'' ﴿حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۞﴾ ''یہاں تک کہ (وقت کے) رسولؑ اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی! (تب انہیں خوشخبری سنائی گئی) آگاہ رہو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے''۔ اور اس کے ایک ہی آیت کے بعد مسلمانوں سے فرما دیا گیا: ۝ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ

كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾ ''تم پر یہ قتال فرض کر دیا گیا (یہ دعوت آج اپنے اگلے مرحلے میں داخل ہوگئی) اور یہ تمہیں ناپسند ہے''۔ تم پر یہ حکم بڑا بھاری گزر رہا ہے۔ ﴿وَعَسٰۤی اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ۚ﴾ ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو درآنحالیکہ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہو''۔ ﴿وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ ؕ﴾ ''اور ہو سکتا ہے کہ کسی چیز سے تمہیں محبت ہو (وہ تمہیں پسند ہو) درآنحالیکہ فی الواقع وہ تمہارے لئے شر ہو''۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ ''اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔

ایک آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ یہاں اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا چونکہ بحیثیتِ مجموعی بھی ایک تجزیہ عرض کیا گیا ہے لہٰذا اسی حوالے سے یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر تاریخ بنی اسرائیل کی اس اہم جنگ کا تفصیلاً ذکر آیا ہے جسے ان کی تاریخ میں جنگِ بدر کے قائم مقام سمجھا جا سکتا ہے جس کے بعد کہ ان کے دُنیوی اقتدار اور جاہ و جلال کے دور کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ طالوت اور جالوت کے مابین ہوئی جس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا وہ عہدِ حکومت ہے جسے بجا طور پر تاریخ بنی اسرائیل کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں اس اہم تاریخی واقعے کا ذکر دراصل مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ اب وہی مرحلہ تمہاری تاریخ میں بھی آیا چاہتا ہے۔ یہ گویا پیشگی خبر تھی غزوۂ بدر کی جو نقطۂ آغاز ہے ایک طویل سلسلۂ قتال کا جس کے پہلے مرحلے کا اختتام ہوتا ہے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں سفر تبوک پر۔ اب ان شاء اللہ آئندہ اس منتخب نصاب کے حصہ پنجم میں صرف ایک تقریر میں کوشش کی جائے گی کہ اس پورے سلسلۂ قتال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔

علّامہ اقبال اور پاکستانی قوم

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

سوانحی خاکہ

علامہ اقبال کے اجداد کشمیری پنڈت تھے جو ایک ولی کامل کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ آپ کے والدین نے سیالکوٹ میں رہائش اختیار کی جہاں ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں آپ کی پیدائش ہوئی اور اقبال نام رکھا گیا۔ مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کیا اور مرے کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں آپ کو شمس العلماء مولانا سید میر حسنؒ جیسا استاد مل گیا۔ انہوں نے آپ کے اندر جوہرِ قابل کو دیکھا تو بھرپور توجہ دی۔ یہاں سے اقبال کی صلاحیتوں کو نمایاں ہونے کا موقع ملا جس کا اعتراف ان کے اساتذہ نے بھی کیا۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ وقت کے معروف ترین تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور فلسفہ اور عربی کے مضامین کے ساتھ بی۔اے پاس کیا۔ پھر وہیں سے فلسفہ میں ایم۔اے کیا اور جلد ہی اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اگلے ہی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ کالج کے زمانہ طالب علمی میں انہیں ڈاکٹر آرنلڈ کی صحبت نصیب ہوئی جو خود انتہائی علم دوست انسان تھے۔ انہیں عربی اور اسلامیات سے بہت دلچسپی تھی۔ عیسائیت پر پختہ یقین کے باوجود تعصب سے پاک تھے۔ ''دعوت اسلام'' ان کی مشہور کتاب ہے۔

۱۹۰۵ء میں آپ برطانیہ گئے۔ کیمبرج میں داخلہ لیا اور فلسفۂ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے مقالہ کا عنوان تھا: Development of Metaphysics in Persia اب آپ لندن واپس آئے تو بیرسٹری پاس کی۔ یہاں ڈاکٹر آرنلڈ کی غیر حاضری میں چھ